© rasailojaraid.com

کے بدلے انہوں نے مجھے اتنے ہزار ڈالر عطیہ کیے۔''

ان فروخت کیے گئے بے گناہ وطن کے باسیوں سے ہزاروں کا اب تک سراغ نہیں ملا اور جن کا سراغ ملا مثلاً وطن کی بیٹی ڈاکٹر عافیہ اُنہیں آزاد نہیں کرایا گیا......ڈالروں کی بارش جاری تھی کہ لنگور آقا نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے حکم دیا: ''ملک بدر سردار اور سردارنی کو واپس آنے کی اجازت دی جائے۔'' حکم پر عمل میں پس و پیش جاری تھی کہ سردار اور سردارنی آدھمکے۔ منتقم مزاج مسٹر بھیڑیے کو ان رقیبوں کی واپسی اچھی نہ لگی۔ دونوں پر حملے کروائے گئے۔ سردارنی ماری گئی۔ سردار شیر خان بچ گیا۔ مسٹر بھیڑیے نے سردارنی کے شریک حیات کو شریکِ حکومت کر کے جاں بخشی کرائی۔ سردار زردار مسٹر بھیڑیے سے بھی چالاک نکلا، چند ہی دنوں میں مسٹر بھیڑیے کو بھاگتے بنی مگر قدرت کا ایک قانون ہے جو کرو گے سو بھرو گے، جو بوؤ گے سو کاٹو گے......

مسٹر بھیڑیا مکّے لہراتا ہوا واپس جنگلستان پہنچا کہ ''میں ڈرتا ورتا کسی سے نہیں۔'' اس نے چند سال پہلے اعلیٰ عدلیہ کے پانچ درج ججوں کو معزول و محبوس کیا تھا۔ اب آتے ہی اس نے ایک اعلیٰ عدالت سے ضمانت کروالی مگر جونہی ایک بڑے جج نے اس کی ضمانت منسوخ کی اسے چوکڑیاں بھول گئیں۔ اب وہ اپنے ہی تعمیر کردہ جیل خانے کی سلاخوں میں قید ہے۔ مسٹر زردار کی حکومت جا رہی ہے۔ شریف باسیوں کی گمشدگی اور اغوا بھی جاری ہے۔ ڈالروں کی برسات کا رخ صدارتی محل سے دبئی اور سوئٹزرلینڈ پھر برطانیہ اور امریکہ تک کے علاقوں کو اپنی زد میں لے چکا ہے۔ مگر اسی دوران جنگل کا بادشاہ اپنے لاؤ لشکر اور اصلی جنگل کے قانون کے ساتھ آزاد ہو چکا ہے۔ بوڑھے شیر خان کی تاج پوشی قریب ہے۔ جنگل کے سب درندے اس کی خوشامد میں لگے ہیں جب کہ سادہ و رنگین داستان والے مظلوم باسی سہمے ہوئے ہیں کہ دیکھیں اب اعلیٰ عدلیہ کا قانون غالب آتا ہے یا جنگل کا قانون ہی اپنی طوفان سامانیوں کے ساتھ برقرار رہتا ہے۔ شیر خاں کی تاج پوشی کی تقریب میں ہندوستان، ایران، شام، لبنان، افغان اور عراق کے علاوہ آل بوزنہ کے تمام جنگلات کے سفیر و مشیر شریک ہونا متوقع ہیں۔ شیر خان اگر بے گناہ جلا وطن بیٹی ڈاکٹر عافیہ اور دیگر مظلوم ہم وطنوں کو واپس لانے، مسٹر بھیڑیے سے شہید اکبر بگٹی اور مظلوم شہید بنات حفصہ کا بدلہ لینے میں کامیاب ہو گئے اور اللہ کا نام لینے والے مراکز و مدارس کو نشانہ نہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اپنے محسن ضیاء الحق کی طرح تعلیمی نصاب کو مقامی زبانوں میں اسلامی بنیادوں پر قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یقیناً وہ جنگلستان کو پاکستان بنا کر اپنا نام رہتی دنیا تک زندہ کر جائیں گے۔ باقی رہے نام اللہ کا۔

؎ ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے　　　　کر لے جو کرنا ہے آخر موت ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پروفیسر خالد شبیر احمد قسط: ۲۵

ورق ورق زندگی

قاضی احسان احمد شجاع آبادی یونیورسٹی میں:

اُس دن میں حیران ہو گیا جب قاضی احسان احمد شجاع آبادی مجھے ملنے کے لیے یونیورسٹی میں میرے شعبے ڈیپارٹمنٹ آف پولیٹیکل سائنس میں تشریف لائے۔ اُن کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا جس کے منہ پر چمکدار سیاہ داڑھی ایسے سج رہی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ اُسے دیکھتا ہی رہے۔ میں نے حیرانی سے قاضی صاحب سے پوچھا کہ آپ کو کیسے پتہ چل گیا کہ میں آج کل یہاں زیرِ تعلیم ہوں، کہنے لگے: ''تمہاری کون سی بات مجھ سے چھپی ہوئی ہے، مجھے تو تمہارا اُسی طرح خیال رہتا ہے جس طرح میرے دوست تمہارے ابا تمہارا خیال رکھتے ہیں۔''

میں نے پوچھا کہ آپ کے ساتھ کون ہیں ان کا تعارف تو کرائیے۔ کہنے لگے:

''یہ قاری نورالحق ہیں میرے داماد۔ انہوں نے بھی تمہارے شعبہ پولیٹیکل سائنس میں داخلہ لے لیا ہے اور میں اسے تمہارے سپرد کرنے آیا ہوں کہ یہ اس آب و ہوا سے آشنا ہی نہیں اور تم تو اب اسی کے ہو کے رہ گئے ہو، تم گورنمنٹ کالج میں تھے تو وہاں بھی طلبا کے لیڈر تھے اور میری رپورٹ کے مطابق یہاں یونیورسٹی میں بھی لیڈری کر رہے ہو۔ بہر حال اس نو وارد کی ذمہ داری اب تم پر ہے۔''

میں چاہتا تھا کہ قاضی صاحب کو کینٹین میں لے جاؤں اور اُن کی کچھ تواضع کروں لیکن انہوں نے معذرت کر لی اور وہ قاری نورالحق کو میرے سپرد کر کے چلے گئے۔ لیکن اس دن میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا کہ میرا ایک قائد جن کی عظمت کا میں بچپن ہی سے مداح تھا اور وہ مجھ سے ایسا بے تکلف انداز برتتے ہیں شاید کسی دوسرے قائد احرار نے مجھ سے ایسی بے تکلفانہ گفتگو نہ کی ہو اور پھر مجھ پر ایسے اعتماد کا مظاہرہ کیا ہو۔ میں اس وقت فائنل ایئر کا سٹوڈنٹ تھا اور قاری نور الحق صاحب سالِ اوّل یعنی ففتھ ایئر میں داخل ہوئے۔ قاضی صاحب کے فرمان کے مطابق میں نے بساط بھر کوشش کر کے اُنہیں کسی قسم کی کوئی دقت یا مشکل پیش نہ آنے دی اور ایک سال کا عرصہ ہم نے یونیورسٹی میں اکٹھا گزارا جس نے ہمیں دوستی کے محترم تعلق میں جوڑ دیا اور بعد میں جب میں ملتان آیا تو یہ دوستی مزید آگے بڑھی۔ جس کا بیان اپنے وقت پر ہوگا۔

ناصر سمشی:

یونیورسٹی میں سیکڑوں طالب علموں کے ساتھ میل جول کا موقع ملا۔ ان میں سے ہر ایک میرے لیے نیا تھا، شعبہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے اندر بھی تقریباً تمام طالب علم مجھ سے اچھے تعلقات رکھتے تھے۔تقریباً سبھی ساتھیوں کا رویہ میرے ساتھ مخلصانہ اور دوستانہ تھا، میں جب بھی اللہ کی اس نعمت کو محسوس کرتا تو بے ساختہ بے تحاشا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا۔آغا ناصر اور میاں اکبر فیصل آباد سے ہی میرے ساتھی تھے اور یہاں ہم اکٹھے ایک ہی شعبے میں زیرِ تعلیم تھے، یہاں بھی وہی بے تکلفی تھی جیسی ہماری گورنمنٹ کالج میں تھی۔ یہاں پر تمام طالب علم ہماری رائے کا احترام کرتے اور اسے مانتے تھے۔لیکن سب میں سے کوئی بھی دوستی کے زمرے میں نہیں آتا تھا صرف ایک ناصر شمسی تھا جسے میں اپنا دوست کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں۔ میں اب کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ آخر اس میں کون سی ایسی خوبی تھی جس نے مجھے اس کی شخصیت کا گرویدہ بنالیا۔اس کا خلوص اس کی محبت اس کی وضع داری سب ہی منفرد تھے۔اندازِ گفتگو ایسا تھا کہ ہم خطابت کے عاشق احراریوں کو بھی لبھالے۔ لہجے کی نرمی اور آواز میں مٹھاس، وہ بولتا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی کانوں میں رس گھولتا چلا جارہا ہے۔ناصر شمسی کا تعلق بنیادی طور پر سیالکوٹ سے تھا۔اس کے والد سید احمد حسن شاہ صاحب نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بطور ٹیچر عمر گزاری۔ وہ اپنے علاقے کے معززین میں شمار ہوتے تھے۔ہم دونوں اپنے شعبے میں جب چھٹی ہوجاتی تو گھنٹوں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے اور وقت کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے کہ ہم نفسی اور ندیمی کے سب ادبی وتاریخی استعارے اور تلمیحیں یاد آنے لگیں۔

مہر محمد فیروز ڈاہر:

مہر محمد فیروز ڈاہر جو سکول کے زمانے سے ہی میرا عزیز ترین دوست تھا۔کبھی کبھی مجھے ملنے کے لیے لاہور آجاتا۔ مجھے تسلی دیتا اور میرے ناگفتہ بہ حالات کو دیکھ کر مجھے حوصلہ دیتا تھا کہ یہ چند دن یوں گزر جائیں کہ جیسے آئے ہی نہیں تھے۔پھر وہ مجھے لے کر کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھلاتا اور میرے ساتھ سیر کرتے ہوئے دن گزارتا، رات کو میرے ساتھ ہی دفتر کے فرش پر سو رہتا۔میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر وہ میری ڈھارس نہ بندھائے رکھتا تو میرا یہ کٹھن وقت مزید مشکل ہوجاتا۔

والدِ محترم کی بصیرت افروز تربیت:

جب میں نے بی۔اے کا امتحان پاس کیا تو والد صاحب میرے گھر بیٹھنے پر میری سرزنش کرتے اور کہتے کہ گھر کیوں بیٹھے ہو،کوئی کام تلاش کرو۔میں کہتا کہ میں نے ملازمت نہیں کرنی تو وہ کہتے پھر کیا کرنا ہے۔میں کہتا میں نے آگے پڑھنا ہے۔ تو کہتے پھر جاؤ لاہور وہاں سے اپنا ڈیٹیل نمبر سرٹیفکیٹ لے لو اور کہیں داخل ہوجاؤ۔لیکن میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں تمہیں باقاعدگی کے ساتھ کچھ ماہانہ مہیا کرسکوں۔تم نے پڑھنا بھی ہے اور کوئی نہ کوئی کام بھی کرنا ہے۔جس سے تمہارا گزارا ہوسکے،ان حالات میں میں گھر سے نکل کر لاہور داخل ہوا تھا۔اس وقت تو مجھے ان کی یہ سختی اتنی اچھی نہیں لگتی تھی لیکن بعد میں مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اگر وہ اس وقت میرے ساتھ مجھے اس طرح نہ کرتے تو شاید میں مستقبل میں کبھی کامیاب نہ ہوتا میں لاہور دو سال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان حالات میں پڑھتا رہا۔اور بالآخر اپنی ہمت اور اپنے عزم کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ کر رہا۔

کپتانی کا مسئلہ:

یہاں پر یہ بات بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ فائنل ائیر میں بھی جب میں پنجاب یونیورسٹی ہاکی ٹیم کا رکن بن گیا تو پنجاب یونیورسٹی ہاکی ٹیم کی کپتانی میرا استحقاق تھا۔کیونکہ سالِ اوّل یعنی فرسٹ ائیر سے ہی میں یونیورسٹی ہاکی ٹیم کے لیے منتخب ہو رہا تھا۔اور اس سے پہلے سال میں یونیورسٹی ہاکی ٹیم کا سیکرٹری رہا تھا۔لیکن ہوا یہ کہ میری بجائے ایک دوسرے لڑکے منوّر کو یونیورسٹی ہاکی ٹیم کا کپتان بنا دیا گیا۔میں ایسے میں بہت پریشان اور دل زدہ ہوا۔میں چاہتا تھا کہ میں اپنے حق کے لیے لڑوں لیکن شنوائی نہ ہوئی تو میں خاموش رہنے لگ گیا۔میری خاموشی میرے چچا جناب خضر تمیمی صاحب کو محسوس ہوئی۔ایک روز انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ بات کیا ہے۔میں نے تمام قصہ اُنہیں سنا دیا تو کہنے لگے کہ میں اس کے خلاف عدالت میں ''رٹ'' کر دیتا ہوں۔میں نے کہا کہ میں نہیں چاہتا میں عدالت تک جاؤں۔میں نے اے۔ایل کھوکھر صاحب سے ایک دفعہ پھر رابطہ کیا کہ آپ جس لڑکے منوّر کو میری جگہ کپتان بنا رہے ہیں کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کا ہی شروع سے طالب علم ہے جبکہ میں فیصل آباد سے یہاں آپ کے کالج میں آیا ہوں تو انہوں نے مجھے برملا کہہ دیا کہ ہاں وجہ یہی ہے۔اس پر میں خاموش ہو گیا اور دل کو تسلّی دی کہ کوئی بات نہیں یہ بھی برداشت کرنا پڑے گا کہ زندگی کی راہ پر ایسا بھی ہوتا ہے۔اس سال انٹر یونیورسٹی ہاکی ٹورنامنٹ کھیلنے کے لیے ہمیں سندھ کی ''جام شورو'' یونیورسٹی جانا تھا۔یہاں پر پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں کی ہاکی ٹیموں نے جمع ہو کر ٹورنامنٹ میں شرکت کرنا تھی۔جس دن ہم لاہور سے ریل گاڑی کے ذریعے حیدرآباد روانہ ہوئے وہ لڑکا جس کو میری جگہ ناجائز طور پر پنجاب یونیورسٹی ہاکی ٹیم کا کپتان بنایا گیا تھا وقت پر ریلوے سٹیشن پر ہی نہ پہنچ پایا اور ہاکی ٹیم لاہور سے حیدرآباد کے لیے روانہ ہو گئی۔حیدرآباد سے ہم بذریعہ بس جام شورو کے لیے روانہ ہوئے۔شام کے قریب بلکہ رات کو ہماری ٹیم اپنی منزل مقصود پر پہنچی۔آرام کیا تو رات کو کھوکھر صاحب ہمارے کمرے میں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ ٹورنامنٹ انتظامیہ نے مجھ سے رابطہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ آپ کا پہلا میچ صبح کو پشاور یونیورسٹی سے ہوگا۔اب منور تو آیا نہیں ہے اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ٹیم کی قیادت تم ہی کرو گے۔ساری ٹیم سامنے بیٹھی سن رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ دیکھو اللہ تعالیٰ کیسے اس شخص کو یہ کہنے پر مجبور کر رہا ہے کہ ٹیم کی قیادت تم ہی کرو گے۔جس نے چند روز پہلے مجھے صاف کہہ دیا تھا کہ منوّر کو تم پر اس لیے ترجیح دے رہا ہوں کہ وہ شروع سے ہی ہمارے کالج یعنی گورنمنٹ کالج لاہور کا کھلاڑی ہے۔بہر حال میں نے جواب میں ان سے کہا کہ میں قیادت کروں گا بشرطیکہ آپ کپتانی کا سرٹیفکیٹ بھی مجھے ہی دیں گے۔یہ نہیں ہوگا کہ قیادت مجھ سے کروائیں اور سرٹیفکیٹ آپ پھر اسی منور کو ہی دے دیں۔اس پر انہوں نے کہا کہ نہیں قیادت بھی تم ہی کرو گے اور سرٹیفکیٹ بھی تمہیں ہی ملے گا۔اور کالج کا ''رول آف آنرز'' کا سرٹیفکیٹ بھی تمہارا ہی ہوگا۔چنانچہ وہ ٹورنامنٹ میری قیادت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہی کھیلا گیا اور پنجاب یونیورسٹی کی ہاکی ٹیم کی کپتانی کا سرٹیفکیٹ بھی مجھے ہی ملا۔ ”ناخدا جن کا نہ ہو اُن کا خدا ہوتا ہے“

میاں زاہد سرفراز کا الیکشن (۵۹۔۱۹۵۸ء)

ہم فائنل ایئر میں تھے تو میاں زاہد سرفراز ففتھ ایئر میں ہمارے ساتھ آ ملے، وہ بھی سیاسیات کے شعبے میں داخل ہوئے۔ اُن سے پھر وہی رابطہ بحال ہو گیا جو فیصل آباد سے شروع ہوا تھا۔ جب ہم سالِ اوّل میں وہاں اکٹھے تھے۔ یونیورسٹی سٹوڈنٹ یونین کا انتخاب نزدیک آیا تو میاں زاہد کو ہم دوستوں نے کہا کہ تم اس میں حصہ لینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہاں لاہور کے ہر کالج میں ہمارے فیصل آباد کے طالب علم موجود ہیں۔ جن کے تعاون سے ہم الیکشن جیت سکتے ہیں۔ میاں زاہد سرفراز تیار ہو گئے اور ہم نے پنجاب یونیورسٹی کی جنرل سیکرٹری شپ کے لیے باقاعدہ میاں زاہد سرفراز کے کاغذاتِ نامزدگی الیکشن کمیشن کے سامنے پیش کر دیے۔ ان کے مقابلے میں کمال اظفر صاحب تھے۔ جن کا تعلق شاید کراچی سے تھا لیکن یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات میں زیرِ تعلیم تھے۔ شعبہ معاشیات میں بھی ہمارے فیصل آباد کے ساتھی زیرِ تعلیم تھے۔ جن میں خاص طور پر میرے قریبی دوست محمد یعقوب اور مظہر حسین شیخ قابلِ ذکر ہیں۔ لا کالج میں تو ہمارے کالج یعنی فیصل آباد کے کئی دوست تھے۔ جن میں چودھری یونس اور ان کے ساتھ کئی دوسرے ساتھی ہمارے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ تھے۔ انتخابی مہم کا آغاز بڑے زور و شور سے شروع ہوا اور وہ سب کچھ ہوا جو کہ اس زمانے کی طلبہ سیاست کی شان و شوکت تھی۔ یعنی مباحثے، گفتگوئیں، کنویسنگ وغیرہ۔ طالب علم اپنی مرضی سے ووٹ دیتے تھے۔ بہر حال یہاں پر ہمیں کامیابی ہوئی اور میاں زاہد سرفراز پنجاب یونیورسٹی کے جنرل سیکرٹری چن لے گئے۔ کمال اظفر صاحب کو شکست ہوئی۔ اس الیکشن کا کامیابی کا سہرا فیصل آباد کے اُن طلبا کے سر تھا جو یہاں پر گورنمنٹ کالج، اسلامیہ کالج، لا کالج اور دوسرے کئی کالجوں میں اپنی تعلیم کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ اس ساری کامیابی میں سب سے زیادہ کردار میاں اکبر، آغا ناصر، محمد یعقوب جنھوں نے بعد میں سٹیٹ بنک آف پاکستان کے گورنر بننے کا اعزاز حاصل ہوا اور مظہر حسین شیخ کے ساتھ کچھ نہ کچھ میرا بھی تھا کہ اس الیکشن میں ان تمام طلبا نے کمپین کی قیادت مجھے ہی سونپ رکھی تھی۔ بہر حال میاں زاہد سرفراز کی اس کامیابی نے پوری یونیورسٹی کے طلبا میں فیصل آباد کے طالب علموں کا مقام بلند کر دیا۔ اور ہم نے پورے جوش و خروش کے ساتھ اس فتح کا جشن منایا۔ یہ لاہور کے دو سال کے قیام کا ایک اہم انتخابی معرکہ تھا جسے سر کیا گیا۔ اور شاید اسی فتح نے میاں زاہد سرفراز کو سیاسی مستقبل کی راہ دکھائی اور وہ دو دفعہ ملک کے مرکزی وزارت تک پہنچے، ایک دفعہ وزیر تجارت اور پھر وزیرِ داخلہ بنے۔

شادی: (۳۰؍نومبر ۱۹۵۸ء)

امتحان قریب آ رہے تھے اور میں اپنے امتحان کے لیے فکرمند تھا کہ اچانک میرے سسرال والوں نے والد صاحب سے تقاضا شروع کر دیا کہ شادی کرو ہمیں حج کے لیے جانا ہے۔ والد صاحب نے معذرت کی مگر اُن کی معذرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قبول نہ ہوئی اور اچانک شادی کا اہتمام کرنا پڑا۔ چنانچہ ۳۰ رنومبر ۱۹۵۸ء کو میں اپنے باراتیوں کے ساتھ فیصل آباد لال ملز سے روانہ ہوا، چنیوٹ میں نکاح ہوا، ولیمہ میں شرکت کی اور ہم دونوں شادی کے بندھن میں باندھ دیے گئے۔ اس موقع پر میرے تاثرات عجیب وغریب تھے۔ امتحان سر پر تھا اور اس سے تین چار ماہ پہلے شادی ہوگئی۔ شادی کے تیسرے دن میں اپنے گھر میں کھانا کھا رہا تھا کہ اچانک والد صاحب جو اس موقع پر شادی کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے اور کچھ ناراض بھی تھے مجھے مخاطب ہوئے اور سارا غصہ یہ کہہ کر مجھ پر نکالا کہ ''تم نے اپنا مستقبل تباہ کرلیا ہے'' انہوں نے انگریزی میں کہا:

You have spoil your carrier.

یہ فقرہ مجھ پر بجلی بن کر گرا اور وہ لقمہ جو میرے منہ میں تھا ابھی حلق سے نیچے نہیں اترا تھا کہ میں نے سفر کا ارادہ کر لیا اور بیوی کو الوادع کہہ کر لاہور چلا آیا۔ آ کر میں نے اپنے چچا خضر تمیمی ایڈووکیٹ کو جو ابھی اپنے دفتر میں ہی تھے سلام کیا تو وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوگئے کہ تم آ گئے ہو، میں نے کہا جی میں آ گیا ہوں۔ اس لیے کہ امتحان بھی تو پاس کرنا ہے۔

یہ شادی میری اپنی مرضی کی تھی سیکنڈ ائیر میں تھا تو میری منگنی ہوگئی تھی۔ ہم دونوں بچپن میں اکٹھے کھیلتے کھیلتے جوان ہوئے تو میں نے اُنہیں ہی اپنا جیون ساتھی چن لیا تھا۔ میری شادی میں میرے تمام دوستوں نے شرکت کی۔ جس میں میاں اظہر کے بڑے بھائی میاں اکبر، اشرف، ڈاکٹر یعقوب، مظہر حسین شیخ، احمد اسلم، ڈاکٹر سرفراز علی، مشتاق نسیم اور خالد محمود۔ مگر شادی کی خوشی ادھوری تھی اس لیے کہ امتحان کے فکر کی تلخی بھی اس میں شامل تھی۔ یونیورسٹی میں واپس آ کر پھر وہی روز مرّہ معمولات شروع ہوگئے اور ہم امتحان کے بالکل قریب آ گئے۔ ہمارا ایک آخری پرچہ دو حصوں پر مشتمل ہوا کرتا تھا، ایک حصہ میں انٹرویو اور دوسرا حصہ مقالہ کا تھا۔ میں نے اپنے مقالے کے جو عنوان اپنے صدر شعبہ سیاسیات ڈاکٹر فریٹز کو دے رکھا تھا۔ ''تحریکِ احرار'' تھا۔ اسے انہوں نے مسترد کر دیا اور وجہ یہ بتائی کہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ملک کے اندر مارشل لا نافذ ہو چکا ہے۔ اس لیے تم کسی سیاسی موضوع پر کچھ تحریر نہیں کر سکتے۔ اس کے بجائے میں نے اپنے مقالے کا عنوان تبدیل کر دیا۔ ''اسلام میں جہاد کی حقیقت'' (The Natuer of Jihad in Islam) اس مارشل لا کے نفاذ کے ساتھ ہی ہماری جماعت احرار اسلام پر پھر دوبارہ پابندی لگ گئی اور جماعت کی تنظیم نو کا جو عمل شروع ہوا تھا وہ ایک بار پھر رک کے رہ گیا۔

یونیورسٹی کے آخری امتحان:

اب دن رات امتحان کی فکر مجھے کھائے جا رہی تھی۔ ہاکی کا پیریڈ بھی اب ختم ہوگیا تھا۔ پھر میں نے ان دو سالوں میں ہاکی کھیلی، روزنامہ پاکستان ٹائمز میں ہر میچ پر میرے لیے بڑے اچھے تبصرے چھپتے رہے میں لاہور ڈسٹرکٹ ہاکی ٹیم کا بھی رکن بن گیا اور اپنے کھیل کی وجہ سے میں نے لاہور ڈویژن میں بھی اپنا مقام بنا لیا تھا۔ اب لاہور ڈویژن کی ہاکی ٹیم کے لیے ایک کیمپ میں شمولیت کرنا تھی جو میں نے نہ کی کہ اسی طرح شاید میں اپنے امتحان کی مکمل تیاری کرسکوں۔ اور اگر میں کیمپ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شامل رہتا تو اس کے بعد ایک رستہ پاکستان ہاکی ٹیم میں شمولیت کا مجھے مل سکتا تھا۔ لیکن میں نے اس کیمپ میں شمولیت کی بجائے امتحان کی تیاری کو فوقیت دی اور کیمپ کو چھوڑ دیا۔ امتحان شروع ہوا۔ ہر پرچہ دینے کے بعد ہم سب دوست آپس میں بیٹھتے اور پرچے پر گفتگو کرتے۔ ایک ایک کر کے پرچے ہوتے چلے گئے اور سر کا بوجھ آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ ہمارے دادا جی کے ایک دوست جن کا دفتر ہمارے دفتر کے ساتھ تھا چنیوٹ کے شیخ تھے اور وہ کبھی کبھی اپنے دفتر میں آتے اور مجھے ضرور ملتے تھے۔ امتحان کے دوران بھی ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پورے تیقن سے کہا کہ بیٹے تم پاس ہو جاؤ گے۔ یہ فقرہ وہ ہر دفعہ جب مجھے ملتے تو ضرور کہتے تھے اور میں چپ کر کے سن لیا کرتا تھا۔ لیکن اس بار میں نے اُن سے پوچھ ہی لیا کہ شیخ صاحب آپ اتنے اعتماد کے ساتھ یہ فقرہ میری حوصلہ افزائی کے لیے کہتے ہیں یا اس کے علاوہ کوئی اور بات بھی آپ کے ذہن میں ہوتی ہے۔ کہنے لگے نہیں بیٹا میں محض تیری حوصلہ افزائی کے لیے نہیں کہتا بلکہ میرا مشاہدہ ہے کہ: ''جن حالات میں تم یہاں پر رہ کر پڑھ رہے ہو ایسے حالات میں رہ کر پڑھنے والوں کو میں نے کبھی فیل ہوتے نہیں دیکھا۔ لہٰذا تم بھی ضرور پاس ہو جاؤ گے۔''

اس فقرے نے مجھ میں اتنا اعتماد پیدا کر دیا کہ مجھے اپنی کامیابی سامنے نظر آنے لگی، بہر حال دن گزرتے گئے اور امتحان بھی ختم ہو گیا۔ آخری انٹرویو بھی ہو گیا تو میں واپس اپنے گھر لوٹ آیا۔

کامیابی کا خواب:

اب انتظار تھا تو فقط نتیجے کا تھا۔ ہر وقت دھیان امتحان کے نتیجے کی طرف تھا۔ ایک رات خواب میں دیکھا کہ میرے سکول کے ہیڈ ماسٹر ملک اللہ یار صاحب مجھے اپنے طارق آباد سکول کی عمارت میں ملتے ہیں اور مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تمہارا امتحان ہو گیا ہے، میں نے کہ جی ہاں ہو گیا ہے اور میں نے اُن سے کہا کہ کیا میں اپنے امتحان میں پاس ہو جاؤں گا؟ کہنے لگے کہ ہاں تم پاس ہو جاؤ گے اور تمہاری سیکنڈ ڈویژن آئے گی نمبر بھی تمہیں بتا دیتا ہوں تقریباً ۳۸۰ کے قریب ہوں گے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ ایف۔ اے کے امتحان میں بھی مجھے بالکل اسی طرح کا خواب آیا تھا کہ ملک اللہ یار صاحب مجھے سکول کی عمارت میں ملے تھے اور انہوں نے مجھے کہا کہ: ''او نالائق کہاں آوارہ گردی کر رہے ہو۔ میں نے فوراً اس کے جواب میں کہا تھا کہ کہیں میں فیل تو نہیں ہو جاؤں گا؟ کہنے لگے میرے ہوتے ہوئے تمہیں کون فیل کر سکتا ہے۔ لیکن ایف۔ اے میں تم نے یہ کیا نمبر لیے ہیں بہت تھوڑے نمبر ہیں اور واقعی ایف اے میں میرے نمبر تھوڑے تھے یعنی تھرڈ ڈویژن۔

اب کی بار جو انہی کو خواب میں دیکھا اور انہوں نے مجھے اچھے نمبروں اور سیکنڈ ڈویژن کی نوید سنائی تو مجھے یقین سا ہو گیا کہ میں ضرور پاس ہو جاؤں گا۔

امتحان کا نتیجہ:

مجھے یاد ہے کہ جس دن میرے ایم۔ اے کے امتحان کا نتیجہ آنا تھا اُسی دن ہم سب اپنے لال ملز کے مالک میاں

© rasailojaraid.com